نیٹشے، رومی اور اقبال

عبدالماجد دریابادی

نیٹشے کی ڈالی ہوئی گرہوں کے سلجھانے پر آیئے، تو بات شیطان کی آنت بن کر رہے۔ جتنی سلجھایئے، اتنی اور الجھتی جائے..... خلاصہ در خلاصہ دو لفظ یہ سن لیجئے کہ جرمنی کے یہ فلسفی صاحب خالق اور مخلوق دونوں سے کچھ روٹھے ہوئے پہلے ہی سے تھے، شوپن ہائر کی پڑھائی نے اور مردم بیزار کر دیا اور ڈارون صاحب کے نظریۂ ارتقا نے اس کڑوے کریلے کو نیم چڑھا کر چھوڑا..... مذہب کے جکڑ بند سے بیزاری اور خیال وعقیدہ کی آزادی پہلے ہی سے تھی، اب بالکل بے قید ہو کر دعوے یہ کر دیئے کہ مذہب خصوصاً مسیحی مذہب کی قائم کی ہوئی روحانی واخلاقی قدریں نری ایک ڈھکوسلا۔ یہ انکسار، یہ فروتنی، یہ علم، یہ قناعت، یہ توکل، یہ صبر، یہ شکر، یہ سب بچوں کے بہلانے کے کھلونے ہیں۔ ان میں نہ حقیقت نہ مغز، انھیں اختیار کر کے جیتے جی مر رہنا ہے اور اب چاہے کوئی فرد وشخص ہو یا جماعت امت اگر اسے عزت و آبرو، لطف وآسائش کے ساتھ زندگی کے دن پورے کرنا ہیں تو عقیدہ وعمل کی ان خوش خیالیوں کو آگ، حشر ونشر، جنت ودوزخ کے چکر میں نہ پڑیئے۔ گردن اٹھا کر سینہ تان کر چلیے، اپنے کو ''ذرۂ بے مقدار'' نہ کہیے، نہ سمجھیے۔ آپ حاکم خود مختار ہیں۔ اپنا نصب العین، حکومت، حاکمیت، غلبہ، تسلط واقتدار کو بنایئے۔ بالادستی کو اپنا شعار رکھیئے۔ جو کمزور راہ میں حائل نظر آئے، اسے کچل دیجئے۔ اوروں کو گرایئے، اپنے کو بڑھایئے۔ رحم وخدا ترسی کے نام پر اپنا دل نہ پگھلایئے۔ حالات کا مقابلہ کلہ برکلہ کیجیے۔ اسے روندیے، اسے پیسیے، خدا وُدا کے وہم میں نہ پڑیئے۔ انسان خاک نژاد میں رکھا کیا ہے۔ جنّی آتش زاد بن کر کچھ دکھایئے۔ بشریت کا دور گزر گیا۔ اب زمانہ فوق البشر بن کر ٹھسے سے رہنے کا ہے۔

نیٹشے کی اس تعلیم کا اثر وقت کی سیاست پر جو پڑ کر رہا اور ملک پر جو نشہ پندار تفوق کا اس سے سوار ہوا، اس کا دردناک، ہولناک، خون بار تماشا دوست دشمن سب نے جرمنی کی دونوں جنگوں میں دیکھ لیا۔

اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۸ء ہے۔ ان کی جب اعلیٰ تعلیم کا وقت آیا تو نیٹشے کی شہرت کا آفتاب چمکا ہوا تھا۔ لاہور، انگلستان، جرمنی سب کہیں کی تعلیم میں نیٹشے کی شخصیت اثر انداز رہی جہاں

تک نیٹشے کے پرشکوہ الفاظ اور رعب افگن اصطلاحات کا تعلق ہے اقبال کا دامن نیٹشائی جاہ وجلال سے خاصا متاثر رہا۔ ''شاہین''، ''شاہین زادہ''، ''عقاب'' کی تلمیحیں کلام اقبال میں بار بار ملتی ہیں۔ یہ سب اسی سرپھرے فلسفی ہی کا فیض ہے اور مخالف طریقوں کو گوسفندی سے تعبیر کرنا، یہ بھی اس کی اپج کی تقلید ہے۔

لیکن بس اقبال کی خوشہ چینی اس جرمن حکیم سے اسی حد پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے جن ناقدوں نے بعض ظاہری الفاظ اور سطحی مشابہت سے دھوکا کھا کر اقبال کو نیٹشے کا طفیلی کسی معنی میں بھی قرار دیا ہے، انھوں نے اقبال پر بھی ظلم کیا ہے اور خود اپنے ذوق سلیم پر بھی۔ اقبال کی نظر آفاقی تھی۔ ان کے اصول اخلاق میں کائنات کی گہرائی روحانیت کی ہم وسعتی تھی، وہ بھلا مادی حد بندیوں کے اندر کیسے محصور رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں بلا کا توازن تھا۔ نیٹشے کو جیسا انھوں نے پہچانا ہے، کم ہی کسی نے پہچانا ہوگا۔ وہ اس کی گرمیِ گفتار کے قائل ہیں، اسے مانتے ہیں کہ اس نے مغرب کی مصنوعی تہذیب وتمدن پر اپنی شمشیر قلم سے خوب خوب چرکے لگائے ہیں۔

حرف او بیباک و افکارش عظیم
غربیاں از تیغِ گفتارش دو نیم

لیکن اس کے باوجود اس کا مرتبہ وہ ایک مجذوب اور وہ بھی مجذوب فرنگ سے آگے نہیں بڑھاتے۔

وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ!

اپنے فارسی کلام میں ذکر اس کا بار بار لائے ہیں، لیکن یہ کہاں تک ذکر خیر ہے اس کا اندازہ بس اس ایک مصرع سے لگا لیجئے۔

قلب اور مومن، دماغش کافرست

اسی کو کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا اور نظم کا جوہر ایک مصرعہ میں سمو دینا۔ متن کی شرح بھی خود ہی ایک حاشیہ میں یہ کر دی ہے کہ ''اس کا دماغ اس واسطے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے گو بعض اخلاقی نتائج اسلام کے بہت قریب ہیں''

اقبال مسلک گوسفندی سے بے شک بیزار ہیں اور اس کی ہجو کھل کر اپنی مثنوی..... اسرار خودی میں کی ہے۔ لیکن اس سے مراد ان کی صرف بعض فرقوں اور مذہبوں کی اس تعلیم سے ہے جو انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہے اور بجائے سخت کوشی، جدوجہد اور ہمتِ عمل کے اسے پیام مجہولیت کا دیتی رہتی ہے۔ اس ملک کو انھوں نے منسوب یونان کے حکیم افلاطون سے کیا ہے اور ان کی تشخیص ہے کہ

مسلمان صوفیوں، شاعروں، واعظوں کے ایک گروہ نے یہ سبق وہیں سے لیا ہے، اور اس کی مصوری انھوں نے یوں کی ہے کہ ایک جنگل میں بھیڑ بکریاں رہا کرتی تھیں اور مزے سے خوب اپنے گھاس چرا کرتیں کہ اتفاق سے شیروں کا بھی اس صحرا میں گزر ہو گیا اور قدرۃً انھوں نے اپنی شیری دکھائی اور بھیڑ بکریوں کی ہڈیاں چبانی شروع کر دیں۔ ان کا صفایا ہونے لگا اور ان کے سارے قبیلے میں کھلبلی مچ گئی۔ اتنا دم ان میں کہاں تھا کہ شیر سے مقابلہ کو کھلے بندوں سوچ بھی سکیں۔ آخر ان میں سے ایک بوڑھی بکری بڑی کاہیاں نکلی، اس لیے بڑے سوچ بچار سے کام لے کر یہ بات دماغ سے اتاری کہ گوسفندی میں شیری پیدا کرنا تو دائرہ امکان سے باہر ہے، البتہ مسلسل وعظ و تلقین کے بعد شیر کو بھیڑ بنایا جا سکتا ہے اور جن کو شیشہ میں اتارا جا سکتا ہے۔ اپنے کو بگلا بھگت بنا، خوب پرچار اپنی درویشی اور بے آزاری کا کیا، یہاں تک کہ خود شیر بھی اس کے حلقۂ عقیدت میں آ آ کر بیٹھنے لگے۔ اب اس نے اپنے وعظ کی باگ یوں موڑی۔

اے کہ می نازی بہ ذبحِ گوسفند
ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند

دوسروں کو مارنے اور ان کی جان لینے میں کیا رکھا ہے، اپنے کو مار کر رکھو اور سعادت کے بام عروج پر پہنچو۔ شیر خود ہی اپنی سخت کوشی سے تھک چکا تھا اور ہر وقت کی دوڑ دھوپ سے عاجز آ چکا تھا۔ افسوں کار گر ہو گیا اور اس نے بھی گھاس کھانا شروع کر دی۔

از علف آں تیزیٔ دنداں نماند　　ہیبتِ چشمِ شرر افشاں نماند
شیر بیدار از فسون میش خفت　　انحطاط خویش را تہذیب گفت

شیر اس دام میں آ گیا، شیری چھوڑ بکری بن گیا۔ گھاس کھا کھا کر نہ دانتوں کی وہ کاٹ رہی، نہ چیر پھاڑ اور نہ پنجوں میں وہ کس بل۔ انسان اسی طرح دنیا کی آرائشوں اور آلائشوں میں مبتلا اور یہاں کی وقتی لذتوں پر فریفتہ ہوا۔ اپنا منصب انسانیت بھلا بیٹھا اور لذتی مشغلوں کو مقصود زندگی بنا اپنے لئے ایک نظام زندگی تکلف، تصنع، تعیش سے بھرا ہوا گھڑ لیا اور اپنا دل سمجھانے یا اپنے نفس کو فریب دینے کو اس مجموعہ کا نام تہذیب و تمدن رکھ لیا۔

اقبال کی تلقین ہے کہ انسان تو دنیا میں اپنے خالق کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس کا کام، تکوینی و تشریعی، ہر حیثیت سے اس کی نیابت کرنا ہے اور علم اور عشق دونوں کی راہ سے اس کی معرفت حاصل کرنا ہے اور اس کے قانون کو نافذ کرنا ہے۔ نیٹشے کے فوق البشر سے دور، اور بہت دور، اقبال کا سمح نظر ایسا مردِ کامل ہے جو جسمانی، دماغی، اخلاقی، روحانی اعلیٰ قوتوں سے مسلح ہو اور اپاہج، کام چور، بد ہمت نہ ہو۔

صاحب عزم و عزیمت ہو اور اپنے فرائض کی ادائی میں چاق و بیدار، مستعد و متحرک ہو۔ خود دکھ اٹھائے دوسروں کو سکھ پہنچائے۔ خود بھوکا رہے دوسروں کو کھلائے۔ خواہشوں کا غلام نہ ہو، ان پر حاکم ہو۔ اقبال اپنے بعض فلسفیانہ مقالوں میں جدھر بھی چلے گئے ہوں لیکن ان کے ضخیم دفتر شاعری میں ایسے مرد کامل کے لیے مذہب کی زبان میں اصطلاح مرد مومن کی ہے فارسی میں اس کو انھوں نے۔

اے سوار اشہب دوراں بیا

کہہ کر پکارا اور بلایا اور اردو میں تو بار بار جان و دل اس کے صدقے کئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک مقام ملاحظہ ہو۔

ہر لحظ ہے مومن کی نئی آن نئی شان — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کے سرودِ ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

اقبال نے طلب علم میں استفادہ اپنے انگلستان اور جرمنی کے استادوں سے نہیں، مشرق اور ہندوستان کے بھی خدا معلوم کن کن زندہ و مرحوم بزرگوں، عالموں، فاضلوں، شاعروں سے کیا (اور کون نہیں کرتا)، چنانچہ بہتوں کے نام صراحت کے ساتھ ان کی نظم و نثر دونوں میں مل جاتے ہیں، لیکن اصل اور پختہ عقیدت انھیں ان ساری باکمال ہستیوں میں صرف ایک شخصیت سے رہی ہے۔ اس کو وہ مرشد روشن ضمیر مانتے ہیں۔ انھیں کی روحانیت کا سہارا ہے کہ وہ فرش خاک سے اڑ کر عالم بالا تک پہنچتے ہیں اور انھیں کا دامن پکڑ کے آسمان کی سیر کر ڈالتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب انھیں سے پاتے ہیں اور ہر گرہ انھیں کے ناخن حکمت و معرفت سے کھلواتے ہیں۔ ان کے مناقب جہاں کہیں لکھے ہیں منقبت نگاری کا حق ادا کر گئے ہیں اور نظر ایسا آتا ہے کہ محبت و عقیدت کے جذبات کے دھارے بے اختیار سینے سے ابلے پڑتے ہیں۔ ایک جگہ یہ انداز ہے۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر — کاروان عشق و مستی را امیر

اور دوسری جگہ کا انداز اس سے زائد والہانہ۔

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب — شیب او فرخندہ چو عہد شباب
فکرِ او روشن ز نور سرمدی — در سراپایش سرور سرمدی
برلب او برپہنسانِ وجود — بند ہائے حرف و صوت از خود کشود